ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

بیرونِ ملک مقیم افسانہ نگاروں کے افسانوں کا نفسیاتی جائزہ

Psychoanalysis of Fiction by Overseas Fiction Writers

حافظ غلام مرتضیٰ
لیکچرار شعبہ اردو، لاہور لیڈز یونی ورسٹی، لاہور
ڈاکٹر محمد عطااللہ
صدر شعبہ اردو، لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور
محمد طاہر علی
پی ایچ ڈی اسکالر

Hafiz Ghulam Murtaza
Lecturer, Department of Urdu, Lahore Leeds University, Lahore
Dr. Muhammad Attaullah
Head of Department of Urdu, Lahore Leeds University, Lahore
Muhammad Tahir Ali
PhD Scholar

Abstract:
Human consciousness has embellished literature and arts with subtle enchantment.This fascination has consciously and unconsciously alienated us from indivieluality by using human psychology and natural instincts in the formation and construction of society.The creater beings to mold his creations through psychological instincts.In this changing world,urdu fiction has created such works of art by embracing human minds and psychological attitudes.The human society is depicted with great skill.There are a large number of fictional writers who have migration to foreign countries,whose imaginations have expanded the pain of migration and the anxiety of being separated from their own.From the partition of india to the present day,There have also been events due to which people have migrated from one place to another,due to this,The stress of migration in urdu fiction has given rise to a special situation on a psychological leve deprivation sisappointment and broken dreams have come down in fictional characters,Therefore the literature created in a foreign country far away from its homeland has started to be interpreted us as mahagiri literature,in which the desires and emotions of the creator and problems of identity in civilization have been highlighted.In the literature,such themes and symbol have started to be used,in which the smell of soil.The memory of the homeland and the problems of settings in a new settlement have become a reality on a psychological level.

Key words:
Mehijri,Psychology,Foreign,Countries,Universality,Instincts,Twentieth,Century,New, Generation,Meaningless,Violation of values, Fear and terror,Identity,Forced transfer,The break down,Geographical limits,Mental confusion.

کلیدی الفاظ:
نفسیات، بیرونِ ممالک، ہمہ گیریت، جبلتیں، بیسویں صدی، نئی نسل، معنویت، اقدار کی پامالی، خوف و ہراس، شناخت، جبری منتقلی، شکستگی، جغرافیائی حدود، ذہنی الجھن۔

زبان و ادب کی کوئی بھی تحریک اپنے عہد کی سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی اور فکری محرکات کی پیداوار ہوتی ہے جس کا اپنا ایک مقصد، نظریہ، سوچ، مزاج اور اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ اس میں انسان کا لاشور فنِ لطیف کے نئے نئے اشاروں کو جنم دیتا ہے اور فن کاروں کے طریقہ اظہار میں ایک زندگی کی لہر جاوداں ہو جاتی ہے۔ جدید نفسیات کی روشنی میں فن کاروں نے اپنی تخلیقات کو نئے قرنوں سے مزین کیا ہے۔ ادیب، مصوّر اور بُت تراش کے وہ

کارنامے جو دھندلکوں میں نقطہ بن کر چھٹ جاتے ہیں، نفسیات کی روشنی سے حسین تخلیق بن کر اُبھرتے ہیں اور بقول ڈاکٹر عزیز فاطمہ کے "فضا اور حالات ادب پیدا کرتے ہیں۔ ادب کی تخلیق کے ذمہ دار فن کار سے زیادہ اُس کا ماحول ہوتا ہے"(۱)۔ اس دور میں سگمنڈ فرائیڈ اور ینگ کی بورژوا تحریروں سے فن کار اس لیے متاثر ہوئے کہ ان کے ماحول میں فرائیڈ کے نظریات کی آؤبکا بہت ہی زور سے پھیل رہی تھی۔ مزدوروں کی حمایت کرنے والے فن کار بھی فرائیڈ، آڈلر اور ینگ کی بورژوا ذہنیت سے متاثر ہو کر اپنی تخلیق میں مشغول ہو گئے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ شعور کی رو ادب کے لیے زہر بھی ہے۔ نظامِ نفسی سے ادب میں گندے کیڑے بھی رینگنے لگتے ہیں اور اشتراکیت اور تحلیل نفسی کے راستے جدا بھی ہیں۔ روسی ادیب و فن کار بھی اس ماحول کی پرچھائیوں سے خود کو الگ نہ کر سکے۔ روس کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اس کے اثرات بڑے گہرے مرتب ہوئے۔ حتیٰ کہ فنِ تعمیر، مصوّری اور سنگ تراشی کو بھی نظامِ نفسی نے شدید متاثر کیا۔

جدید نفسیات سے دنیا کا جو بھی ادب متاثر ہوا ہے اس میں ہمہ گیری، گہرائی اور بے شمار حسین وسعتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ شعور و لاشعور کے ہنگاموں سے ادیب و فن کار کی تخلیق میں زندگی آجاتی ہے اور اس طرح فن کار کو اپنے فن میں لافانی چیزیں چھوڑنے میں کافی مدد میسر آتی ہے۔ ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ تخلیق کے دوران انسان کی وہ اصلی جبلتیں جو فطرت کا کرشمہ ہیں ہمیشہ موجود رہتی ہیں اور کبھی علیحدہ نہیں ہو سکتیں۔ کچھ جبلتیں لاشعور کے پس منظر میں اور کچھ پیش منظر پر رہتی ہیں۔ فن کی یہ جبلتیں Direct اور Indirect دونوں طور پر اظہاریت سے ہم کنار ہوتی ہیں۔ چونکہ انسان شعوری اور غیر شعوری خواہشوں کی آمیزش سے زیست کی دہلیز جھانکتا ہے۔ وہ آرٹ میں انسان کی زندگی اور فن کی جبلتوں کی محبت اور تخریب کی ہم آہنگی کو محسوس کرتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو ایک ادیب و فنکار کے منتشر خیالات اور مختلف بکھرے ہوئے تصورات کی تربیت کرتا ہے۔ اس تربیت میں کوئی خیالی یا کوئی تصور مصنوعی یا مہمل نہیں ہوتا۔ یہ نفسیاتی لہر زندگی میں ایک نئی کرن تابندہ کرتی ہے۔ آبشاروں کی لہروں کی موسیقی پر فن کار ناچتے اور تھرکتے ہیں۔ انسان دنیا میں اپنی بے شمار خواہشوں کو برلانے کی خاطر زندگی میں جدوجہد کرتا ہے۔ وہ خواہشات کے انبر کے گرد چکر لگاتا ہے اور یہی بس اُس کی رقص کرتی حیات ہے۔ انسان کی ان خواہشات کی تکمیل میں سماج کی اخلاقی اقدار اور فطرت کے مابین ہمیشہ تصادم ہوتا رہتا ہے۔ انفرادیت اجتماعیت سے ٹکر لیتی ہے اور کمزور انفرادیت شکست کھانے کے باوجود خاموش نہیں رہتی بلکہ وہ اپنی تمناؤں کو لاشعور کی اندھیری تہوں میں لے جاتی ہے جہاں سماج کی اخلاقی قدریں موجود نہیں۔ لاشعور میں تمنائیں اکثر وبیشتر زیادہ پھیل جاتی ہیں، یہ دبی ہوئی خواہشات بغاوت کے جذبات سے ہم کنار ہونے لگتی ہیں۔ بغاوت کے یہ جذبے سمٹ تو جاتے ہیں لیکن ان کے سمٹنے سے دبی ہوئی تمنائیں پگھل نہیں جاتیں وہ بدستور قائم رہتی ہیں اور اپنے رستے کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔ اس طرح سے فن کار کے تمام ذہنی اعمال لاشعوری طور پر متحرک ہو جاتے ہیں۔ اُردو افسانہ نگاری میں نفسیات کا یہ عمل دخل بہت وسعت اختیار کر چکا ہے۔ اس کے پس پردہ وہ انیسویں اور بیسویں صدی کے اندوہ ناک حقائق اور ہجرت کے مناظر ہیں جس نے جہاں ایک جانب معاشرے کو اجتماعی لحاظ سے متاثر کیا وہیں پر ادیب و فن کاروں کو انفرادی طور پر متاثر کیا ہے۔ اس طرح سے افسانہ کے فکری محرکات میں جہاں سیاسی، سماجی اور تہذیبی امور دکھائی دیتے ہیں وہیں پر معاشرے کی نفسیات کی رنگین جھلکیاں جلوے بکھیرتی ہیں۔

اُردو افسانہ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی تک ایک متعین سانچے اور اصول وضوابط کے تحت لکھا گیا لیکن پانچویں اور چھٹی دہائی کی نئی نسل نے ان اصولوں وضوابط کے علی الرغم ایک ایسی دنیا میں قدم رکھا جہاں اُن سے قبل کے ادیبوں نے کبھی جرأت نہیں کی تھی۔ ترقی پسندوں نے سماجی حقیقت نگاری کو کُل کائنات سمجھ لیا تھا لیکن نئی نسل نے انسانی زندگی سے منسلک ایک نئی کائنات یعنی باطن اور شعور وتحت الشعور کی کائنات کی دریافت کی۔ نئی نسل کی اس دریافت سے افسانے میں فکری وفنی سطح پر بے پناہ تبدیلی اور وسعت آئی ہے۔ انہوں نے اپنی جستجو کے بل بوتے پر افسانے کو کھوکھلی معنویت کے تصوّر، سستی رومانیت، خیالی دنیا اور نظریاتی وابستگی کی دلدل سے باہر نکالا ہے۔ زندگی کی یک طرفہ، سطحی اور ادھوری ترجمانی کے بجائے اسے مکمل طور پر احاطہ تحریر میں لانے کی جسارت کی ہے۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں ہر طرف سائنس وتکنیک کی بالادستی تھی۔ انسانی تہذیب، اخلاقی اقدار کی پامالی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ایسے وقت میں نفسیاتی شعور اور جدیدیت نے جنم لیا جس میں علائم واستعارات کی بدولت نفسیاتی شعور اور لاشعور کی بنا پر کافی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ اس نے نہ صرف ایک صدی میں ہی ادبی دنیا میں اپنی انفرادیت واہمیت کا لوہا منوایا ہے بلکہ اس صنف نے ادبی سرمائے سے رشتہ منقطع کیے بغیر انسانی حیات اور سماج کی

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

مختلف جہات کی ترجمانی عمدہ طریقے سے کی ہے۔ زندگی و سماج کے ہر تغیر و تبدل اور اُتار چڑھاؤ کو وجودیت عطا کر کے عروج کے زینے کی جانب گامزن کیا ہے۔

جدیدیت ایک پُر آشوب عہد کی پیداوار ہے لیکن ہمیں اسی پُر آشوب عہد نے اپنے باطنی اور عصری حقائق، اپنے چہرے اور اپنی ذات سے روشناس کروایا ہے۔ اس عہد میں افسانہ نگاروں نے اپنی ذات کے توسط سے سماجی مسائل کو سمجھا اور انہیں افسانوی بندھن کی ململی چادر میں لپیٹ کر پیش کیا ہے۔ ایسے بہت کم ادیب ہیں جو ظاہر و باطن میں توازن اور اعتدال رکھ پائے ہیں۔ اکثر و بیشتر ادیب زندگی کی بے معنویت، خوف وہراس، تنہائی، تشکیک، اقدار کی پامالی، شخصیت کی شکست وریخت اور جبر و تشدد کو ہی اپنی زندگی کی حقیقت گردانتے رہے۔ انسان کے اندر روشنی بھی ہے اور تاریکی بھی۔ یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ روشنی کے احساس کو زندہ کرے یا تاریکی میں گم ہو جائے۔ دوسری بات جو افسانہ کی سماجی نفسیات میں در آئی ہے وہ ہے اس عہد میں ذات کے بحران اور اُس کی شناخت کی پہچان۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان مشین بنتا جارہا ہے لیکن سوال یہ اُبھرتا ہے کہ آخر یہ مسئلہ کیوں کر پیدا ہوا اور یہ کہ کیسے مشین بنتا جارہا ہے؟ ان سوالات کی آبیاری میں ہمیں تاریخ کے اوراق کو دیکھنا پڑے گا جس کے مطالعہ سے ہجری افسانہ اور اس کی نفسیات کے در کھلتے جائیں گے۔ ظاہری بات ہے کہ یہ بحران، یہ مسئلہ نئے عہد کی پیداوار نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں ماضی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ دوسری جانب یہ بحرانی کیفیت اور نفسیاتی کشمکش نئے دور کی ذہنی پختگی سے مقابلہ نہ کرنے کا اثر ہے۔ ہم وقت اور حالات کے نوحہ گر ہیں لیکن ہم نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کون سے سماجی اور اقتصادی عوامل ہیں جس کی وجہ سے یہ مسائل جنم لے رہے ہیں۔

جدید افسانہ نگاروں کے نہاں خانوں میں وہ تاریخی حقائق کی روداد پنہاں ہے جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان میں تجارتی مقصد کے تحت آنے اور پھر پورے ہندوستان کو اپنے قبضے میں لینے کی داستان پوشیدہ ہے۔ اس کے نتیجے میں ترکِ وطن اور ہجرت جیسے واقعات رونما ہوئے جنھوں نے تقسیمِ ہند کی صورت میں لہولہو واقعات و حوادث کی تاریخ رقم کی۔ ڈاکٹر اعجاز راہی اپنی کتاب "اُردو افسانہ 57ء" میں لکھتے ہیں:

"انیسویں صدی پوری دنیا میں غلامی کے بڑھتے ہوئے دائروں کی صدی تھی لیکن بیسویں صدی ان دائروں کو توڑنے کی صدی ہے۔ جہاں پوری دنیا کا نقشہ بدل رہا تھا اور جغرافیائی حدود میں تبدیلی ہو رہی تھی وہاں ہندوستان کے نقشے میں بھی تبدیلی آئی۔"(۲)

جبکہ رشید امجد اپنی کتاب "پاکستانی افسانے کا فکری اور سیاسی و سماجی پس منظر" میں اس واقعہ کی منظر کشی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"1947ء میں برصغیر دو علیحدہ علیحدہ مملکتوں میں تقسیم ہو گیا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک بڑا انسانی المیہ بھی وجود میں آیا۔ اتنی بڑی سطح پر انسانی خون کی ارزانی اور انسانی وقار کی بے حرمتی نے علیحدہ مملکت کی خوشی کو ایک بہت بڑے دُکھ اور سوگ میں بدل دیا۔"(۳)

تقسیمِ ہند کا سانحہ وقوع پذیر ہوا اور گزر گیا مگر اپنے دوررس اثرات چھوڑ گیا۔ تقسیم کے وقت ہونے والے فسادات اور جبری منتقلی آبادی اور سانحات تھے جنھوں نے براہِ راست فرد کی ذات کو متاثر کیا اور اَن گنت انسانوں کو ان کی تہذیب اور اُن کی زمینوں سے اُکھاڑ کر اجنبی زمینوں اور غیر مانوس تہذیب کی طرف دھکیل دیا گیا۔ نقل مکانی ہر دور میں ہوتی رہی ہے اور مختلف گروہوں یا قبائل کی صورت میں لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے آئے ہیں۔ آبادی کا اتنا بڑا گروہ یا ہجوم اس طرح سے پہلے کبھی بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لیے کبھی بھی مجبور نہ ہوا ہو گا جتنا کہ تقسیمِ ہند (1947ء) کے واقعہ کے تحت منتقل ہوا۔ یہ اتنا بڑا سانحہ تھا کہ لوگوں کے حواس برقرار نہ رہے اور جب انہیں حالات کا شعور حاصل ہوا تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ چناں چہ ترکِ وطن ہونے والی اس نسل کے یہاں ناسٹیلجیا (اپنے گھر جانے کی شدید خواہش، ماضی پرستی اور وطن سے محبت) اپنی پوری آب و تاب سے اُبھرا۔ زندگی کی بے کرانیوں میں اس نسل نے خود کو جلاوطن محسوس کیا۔ برصغیر (پاک و ہند) کی تقسیم کے نتیجے میں تخلیق ہونے والے ادب میں منٹو کے افسانے "کھول دو"، "ٹوبہ ٹیک سنگھ"، کرشن چندر کے افسانے "اندھے"، "لال باغ"، "ایک طوائف کا خط"، "جیکسن"، "امرتسر"، "پشاور ایکسپریس"، قراۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا"، عصمت چغتائی کا "ٹیڑھی لکیر"، راجندر سنگھ بیدی کا "لاجونتی"، عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں" اور احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "نیا فرہاد" وغیرہ اسی ہجرت کے پس منظر میں ضبطِ تحریر میں لائے گئے تھے۔ ان افسانوں میں ہجرت کا کرب اور اس کے نتیجے میں سامنے آنے والی ناسٹیلجیائی صورت حال کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس تقسیم کے ذریعے سے ایک نئی معاشرتی تشکیل صورت پذیر ہونے لگی۔ جلاوطنی اور ہجرت کا سلسلہ

یہیں تک ختم نہیں ہوا بلکہ آنے والے وقت میں اس کی ایک اور صورت نے جنم لیا جس میں کئی نامور ادیب و شعراء اور افسانہ نگار اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں ادب کی نئی بستیاں بسانے پر مجبور ہو گئے۔

اُردو افسانے اور انسانی نفسیات کا جائزہ لیا جائے تو بیشتر اوقات (آزادی کے بعد) تقسیم در تقسیم اور تقسم کی وجہ سے ہونے والی نقل مکانی، اس کے منفی اثرات اور اپنی زمینوں سے اُکھڑ جانے کا قلق اور اس کے نتیجے میں بڑھتے ہوئے محرومی و مایوسی کے سائے افسانوی دنیا کی زینت بنتے سامنے آتے ہیں۔ اس کرب و تنہائی اور شکستہ دلّی کا اظہار روبینہ الماس کچھ یوں کرتی ہیں:

> "آبائی وطن کے چھوٹنے کا کرب، نئی زمینوں میں آبادکاری کا مسئلہ، اجنبیت کا احساس اور شکستہ خوابوں کی کرچیاں، اس نقل مکانی کرنے والی نسل کا کُل سرمایہ ہے اور عرصہ دراز گزر جانے کے باوجود آج بھی لوگ ماضی میں بسیرا کیے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو افسانے میں جلاوطنی کا احساس لاشعوری طور پر اُبھرا۔ جِلاوطنی کے موضوع پر ان افسانہ نگاروں نے بھی لکھا جو ہندوستان سے پاکستان آئے اور اُن افسانہ نگاروں نے بھی لکھا جو پاکستان سے ہندوستان گئے۔"(۴)

ایک اور وجہ جس نے خوابوں کی شکست و ریخت کو کِرچی کِرچی کر کے رکھ دیا وہ تھی ایک نوزائیدہ مملکت میں وسائل کی قلت اور اس پر پناہ گزینوں کی خستہ سامانی۔ وہ راستوں میں لُٹ کر بے سروسامانی کے عالم میں پاکستان آئے تھے جبکہ ہندوستان میں منتقل ہونے والے شرن گارتھے اپنی دولت سمیٹ لے جانے میں کامیاب رہے اور پھر بھارت کے پاس وسائل تھے چناں چہ شرن ناتھیوں کی آبادکاری اتنا بڑا مسئلہ نہ بنی۔ ہندوستان میں مقیم افسانہ نگاروں نے بھی جلاوطنی کے تجربے کو اپنی تخلیقات میں سمو کر پیش کیا جس میں نفسیاتی کیفیات کا برملا اظہار کیا گیا ہے مگر پاکستانی افسانہ نگاروں کے یہاں ناسٹیلجیا کا یہ احساس زیادہ شدت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کے پس منظر میں سیاسی، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی وجوہات تھیں۔ زمین سے بے دخلی کا احساس انسان کی شخصیت کو منہدم کر دیتا ہے کیوں کہ یہ بے دخلی صرف زمین سے رشتہ منقطع ہونا نہیں بلکہ ایک پوری تہذیب، اپنے ماحول، اپنی قدروں اور اپنی روایات سے بھی منقطع ہو جانے کا عمل تھا۔ اس طرح سے اُردو افسانہ نگاروں نے اس احساس کو جو اپنی تہذیب اور اپنی زمین سے کٹ جانے کی صورت میں پیدا ہوتا ہے کو اپنے افسانوں میں اساسی موضوع کی حیثیت سے اختیار کیا۔ ماضی پرستی کا شعور اور وطن سے محبت کا احساس افسانوی سطح پر بلند ہوا۔ اُس ماضی کے کھوج کی تلاش ہے جس سے وہ حال میں محروم ہو چکے تھے۔

برصغیر کی تقسیم ایک ایسا اندوہ ناک اور دل خراش سانحہ تھا جس کی وجہ سے لوگ ہجرت کی جانب مائل بہ سفر ہوئے۔ اس تقسیم سے غیر مطمئن لوگ ہجرت کر کے برطانیہ، جرمنی، امریکہ، یورپ، افریقہ اور عرب کے دیگر ممالک میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ ان لوگوں نے اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنے رشتوں کو پیچھے چھوڑ کر ایک نئی دنیا بسائی۔ ایک نئے ماحول اور نئی بلکہ اجنبی زبان اور اجنبی سرزمین پر قدم رکھا۔ انہوں نے اپنی شناخت کو قائم رکھنے کی خاطر اپنی مادری زبان میں ادب تخلیق کرنا شروع کیا۔ دنیا کی تاریخ میں یہ ایک ایسا موڑ تھا جس میں پہلی مرتبہ اُردو زبان و ادب کا افسانہ اُن ممالک میں لکھا جانے لگا جن کی ثقافت اور تہذیب و تمدن کا مزاج مشرق سے بالکل مختلف تھا۔ اکیسویں صدی میں گزشتہ چار پانچ دہائیوں کے درمیان اُردو ادب کی افسانوی سطح پر ایک نئے اُفق نے رنگ بکھیرنے شروع کر دیئے۔ اُردو افسانہ نگاری کے اُبھرتے اُفق کی نئی بستیوں میں تخلیق ہونے والے ادب کی جانب اشارہ ہے جسے ہم بیرون ملک مقیم افسانہ نگاروں کا ادب یا مہجری ادب کا نام دینے لگے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے ہجرت کے کرب کو نزدیک سے محسوس کیا اور اس کا ہوبہو عکس افسانوی صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے۔

مہجری افسانہ اور اس کے قصوں کے بیچوں و پیچ نفسیاتی کشمکش کے اظہار سے ایک ایسا ادبِ لطیف اُبھر کر سامنے آیا ہے جس کے اندر سے وطن کی خوشبو پھوٹتی سامنے آتی ہے۔ وفا پرستی کے نغمے گونجتے ہیں۔ فدائین اور جان نثاری کا جذبہ جاوداں ہونے لگتا ہے جس کا اظہار افسانہ نگار اپنے تخیل کی بلند پروازی سے کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کی ہر سطر دل نشین ہے اور اسلوب قاری کے لیے مقبول اور پسندیدگی کا سرچشمہ ہے جس سے قارئین کسبِ فیض کرنے لگے ہیں۔ پہلی ہجرت آدم نے جنت سے زمین کی طرف کی اور یوں یہ سلسلہ ازل سے ابد تک کے لیے شروع ہو گیا۔ تاریخ کے اوراق ہجرت سے بھرے پڑے ہیں اور کئی ہجرتیں تو ایسی ہیں جن کے اثرات ابھی تک ہمارے دل و دماغ پر طاری ہیں۔ پہلی ہجرت تقسیم ہند کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ اس نے حساس دل و دماغ کے حامل مصنفین و ادباء پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ہجرت سے جس طرح سے عالمی سیاسی اور ملکوں کی جغرافیائی حدود میں تبدیلی رونما ہو رہی ہے اُسی سطح پر ادب کی دنیا بھی تغیرات سے ہم کنار ہو رہی ہے۔ ادب میں جدید موضوعات، جدید علامات، مٹی کی خوشبو، وطن کی یاد، نئی بستی کے

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

مسائل، وہاں کے حالات اور معاشرتی رموز وغیرہ اپنی اپنی جگہ مسلمہ حقیقت ہیں۔ ہجرت کی بنا پر جہاں ایک جانب ذہنی و نفسیاتی مسائل در آئے ہیں اور سیاسی سوچ میں اختلافات نے جگہ بنا رکھی ہے وہیں پر اقتصادی بحران، لسانیات اور قومیت کے بکھیڑے، یاسیت اور قنوطیت کے مضبوط شکنجے بھی مسلم حقیقت کا روپ دھارے سامنے آرہے ہیں۔ ان تمام اسباب وعلّل نے افسانہ نگاروں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ایک ایسے ادب پارے کو استوار کرنے میں کردار ادا کیا ہے جس کی نظیر اُردو افسانہ نویسی کے جدید رجحان کے حامل بستیوں کا سرمایہ بن چکی ہے۔ اس ادبی سرمایہ کی بستیوں کی روح میں اُن کی نفسیات اور الجھنوں کی جھلک گہرے گھاؤ کی طرح اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ انسانی تاریخِ نفسیات اس بات کی شاہد ہے کہ جس طرح سے جسم کے زخم کو آلاتِ جراحی بھرتے ہیں اسی طرح ذہن اور روح کے زخموں کے گھاؤ کو بھرنے کے لیے روحانی طرزِ علاج کی اشد ضرورت ہوتی ہے اور یہ وہی آلہ جراحی ہے جو ادب کے لیے یادگار اور نہ بھلائے جانے والی تحریر کو جنم دیتا ہے۔

مغرب میں اُردو افسانہ نویسی کی تخلیقیت اور ابتداء اس وقت ہونا شروع ہوئی جب وہاں کی زندگی بنیادی سہولیات سے ہم کنار ہونے لگی۔ وہاں کی حیات مسرت وانبساط اور شائستگی کا پیکر تراشنے لگی۔ تارکینِ وطن جب ہجرت کر کے مغربی ممالک میں جانے لگے تو اس کی بنیادی وجوہ میں ایک طرف تو مشرقی ممالک کی ابتری تھی اور دوسری جانب روزگار کی فراہمی اساسی مسئلہ تھی۔ مہاجرین نے اپنی معاشرتی و اقتصادی صورتِ حال کی بہتری کی خاطر ان ممالک کی جانب رُخ کیا۔ وہاں رہ کر انہوں نے اپنے جذبات واحساسات، معاشرت اور تخلیقی ضروریات کی جانب ایک جست لگائی اور ان لوگوں کے ساتھ نئے رشتے استوار کیے جن کے ساتھ وہ کام کرنے کے علاوہ زندگی گزارنے لگے تھے۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا اور ایسی تخلیقات واحساسات کو موضوع بنایا جہاں ہندو پاک کے افسانوی ادب میں کچھ مشترک خصوصیات پائی جاتی ہیں وہاں مغرب کے اُردو ادب میں مغربیت کی بو باس ہونا فطری امر ہے۔ مغرب کے اُردو طبقہ کی تخلیقات میں تارکین، وطن کی ایسی بہت سی الجھنوں کی جھلک ملتی ہے جن سے وہ اجنبی ملک میں دوچار ہیں۔ مغرب کے مہجری اُردو افسانے کی فضا بالکل ایک نئی جہت سے ہم کنار ہے۔ اُن کا لب ولہجہ اور اسلوبِ نگارش میں ایک طرف مادری زبان کا پہلو جاوداں ہے تو دوسری طرف مقامی مغربی تہذیب وتمدن کا رنگ بھی چڑھا نظر آتا ہے۔ ایک جانب مغرب کی رنگا رنگی، شائستگی اور ترقی سے بھرپور خوشبیوں کی مہک ہے اور جدید نظامِ زیست سے آراستہ آرائشیں انہیں اپنی طرف راغب کر رہی ہیں تو دوسری جانب مشرقی اقدار، رسوم ورواج، کوئل کے ترانے، لوک گیت، سرسبز وشاداب کھلیانوں کی بھینی بھینی خوشبو ہے جو اُن کی وطن سے دوری اور محرومیوں کے احساس کی وجہ سے در آئی ہے۔

"سفر" انسانی حیات کی بقاء کی علامت ہے اور اپنے اندر جہانِ معنیٰ رکھتا ہے۔ یہ سفر ذات سے ذات تک، خارج سے داخل تک اور باطن سے خارج کی طرف ہونے کے ساتھ بیرونی دنیا سے مرکز کی طرف اور مرکز سے بیرونی دنیا کی طرف امکانات کا ایک وسیع منظر نامہ رکھتا ہے۔ جہاں مسافرت انسان کے لیے نئی دنیا کے وسائل دلاتی ہے وہیں مسافرت انسان کے لیے مغائرت کو بھی جنم دیتی ہے۔ انسان اپنے مرکز سے دور مختلف دنیاؤں میں بکھر جاتا ہے۔ یہی مغائرت اور بکھراؤ بالآخر ایک احساس جلاوطنی کا احساس دلانے لگتا ہے۔ ماضی کی بازآفرینی کا احساس شدت سے ہونے لگتا ہے۔ نئے راستے، نئے رشتے، نئے مشاغل کو وہ آہستہ آہستہ گلے سے لگانے لگتا ہے۔ نئی سرزمین اُن کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے اور ان کے وطن واپس آنے کی خواہش تشنہ گام رہتی ہے۔ ان ہجرت زدوں کی زیستیں ہمیشہ حالات کے رحم وکرم پر رہتی ہیں۔ اگر اُس ملک کے جہاں وہ قیام پذیر ہیں معاشی وسیاسی اور سماجی حالات بدل جائیں تو ان تارکینِ وطن کی بقا بھی خاطر میں پڑ جائے گی۔

مغرب کے مہجری افسانہ نگاروں نے اس کرب و تاثیر کے بیان میں نئی علامات، پرانی علامتوں اور استعاروں سے نئے نئے معانی نکال لیے ہیں جس میں اُن کے شعور ولاشعور کی گونج مصفّا ہے۔ مہجری افسانہ نگاروں کے موضوعات زیادہ تر مغربی معاشرے سے متاثر ہیں۔ جب ہم اُن کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُن کے افسانہ نویسی کے اندازِ بیان اور برصغیر (پاک وہند) کے تخلیق کاروں کے افسانوی موضوع میں زمین و آسمان کا فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ جو باتیں لکھ رہے ہیں ان پر ہمارے قلم کار لکھتے ہوئے جھجک محسوس کرتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سچائی وہی ہے مگر مجبوری یہ ہے کہ مشرقی معاشرہ ایسے موضوعات کو قبول نہیں کرتا۔ چناں چہ مہجری افسانہ نگار اپنے قصے کہانیوں میں جو کچھ بیان کرتے ہیں اُس میں کسی طرح کا بناوٹی پن ہرگز نہیں ہوتا۔ اُن کے اندازِ بیان میں بلا کی روانی اور بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ اسی سبب اُن کی تحریریں بہت تیزی کے ساتھ معروف ومقبول ہو رہی ہیں۔

اس مقالے میں اُن ہجرت زدوں کی مجبوریاں اور بے بسی پنہاں ہے جہاں اُن کا غم وملال کہیں آنسو بن کر ٹپکتا ہے تو کہیں بارش کا قطرہ بن کر مسکراتا ہے۔ بادل انہیں محرومی کا احساس دلاتے ہیں۔ تنہائی عرفان عطا کرتی ہے۔ ان افسانہ نگاروں کی کثیر تعداد مہاجر خواتین کی ہے جنہوں نے جذباتی

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

انداز میں ہمارے دل کے تاروں میں سُر لگائے ہیں۔ کورے کاغذ پر دلکش مصوّری کا گُر انہیں خوب آتا ہے۔ وہ اپنی امیج میں کبھی رلاتی ہیں تو کبھی ہنساتی ہیں۔ کبھی رومانوی آہنگ سے مزین ہجر و وصال کے قصے الاپے جاتے ہیں جس میں بیرہ کی ماری دوشیزہ اپنے محبوب کی جدائی کا کرب سہہ رہی ہے تو کبھی یہ ادیب ایک شہر ایک ملک چھوڑ کر اپنے دل کے اندر جہان آباد کر لیتے ہیں۔ اپنی ذات کا عرفان انہیں خود سے کبھی آشنا بنا دیتا ہے اور ایسے میں کوئی ان کا ہمدم و رفیق ہے تو وہ ہے ان کا قلم۔ دل کی پکار سے وہ قصّے تراشتے ہیں۔

ڈاکٹر نگہت نسیم، صفیہ صدیقی، شاہدہ احمد، محترمہ محسنہ جیلانی، انجم سعید، نعیمہ ضیا الدین، رضیہ کاظمی، سمیرہ عزیز، شاہین کاظمی، شکیلہ رفیق، فرحین جمال، فرخندہ رضوی، ارمان یوسف، امجد مرزا امجد، چودھری فیصل نواز، انجم سعید، حمزہ رحمن، خالد سہیل، سیّد عاشور کاظمی، سوہن راہی، شہرت بخاری، عاصم صحرانی اور ہرچرن چاولہ وغیرہ مہاجر ادیبوں کے اس قافلہ کے مسافر ہیں جن کی دو زبانوں، دو تہذیبوں، دو ثقافتوں اور دو معاشروں میں رہنے کے تجربے نے ان کے داخل کی تیسری آنکھ کھول دی ہے۔ یہ تیسری آنکھ انہیں نفسیاتی و معاشرتی اعتبار سے روح کی گہرائیوں میں اُترنے میں مدد دیتی ہے۔

اُردو افسانہ اپنی تخلیق کی دوسری صدی کے تیسرے عشرے میں قدم رکھ چکا ہے۔ اس دوران بے شمار کہانی کاروں نے رہِ دشوار پر قدم جمانے کی کوشش کی مگر ناموری جمانے میں کامیابی ہر کسی کا مقدر نہیں بنتی۔ مقدر اس لیے کہ شہرت کا حصول ہمیشہ سے ابلاغ کے وسائل سے جُڑا ہے مگر ابلاغ کے وسائل ہر کسی کو نصیب نہیں ہیں۔ ہندو پاک کے بعد مغرب اُردو کا تیسرا بڑا مرکز ہے اور آج اُردو داں طبقے کی بستیاں اور مراکز قائم ہو چکے ہیں۔ آج اردو دان طبقہ زیادہ تر مغربی ممالک برطانیہ، ناروے، سویڈن، جرمنی، فرانس، امریکہ، کینیڈا، ساؤتھ افریقہ، آسٹریلیا، خلیجی ممالک اور عرب ریاستوں میں جہاں جہاں اُردو کے شیدا ہجرت کر کے پہنچے وہاں پر انہوں نے نئی ادبی دنیا آباد کرنی شروع کر دی۔ یورپ میں اُردو بولنے، سمجھنے اور لکھنے پڑھنے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ جرمنی میں اس زبان سے جڑی کمیونٹی کا ایک بڑا حصہ برلن، دریائے مائین، تجارتی شہر فرینکفرٹ اور ہائیڈل برگ میں اس مہجری ادب و افسانہ کی آبیاری میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

ڈاکٹر نگہت نسیم ایک مشہور افسانہ نگار، شاعرہ اور کالم نگار ہیں۔ ان کا تعلق پاکستان سے ہے اور کئی دہائیوں سے آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں مقیم ہیں۔ وہ پیشے کے لحاظ سے ماہرِ نفسیات ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے اپنے پیشے سے وقت نکال کر اُردو زبان و ادب اور تہذیب کی خدمت میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ اسی ادبی و علمی کاوش کے طفیل وہ مہجری دبستانِ ادب میں کافی اہمیت کی حامل ٹھہرائی جاتی ہیں۔ اُن کی حیثیت کئی اعتبار سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ مثلاً عالمی اخبار کی نائب مدیر، عالمی سطح پر ریڈیو کی ایک شاخ ایف ایم کی ڈی جے اور اُردو کے ترجمان کی حیثیت سے الیکٹرانک میڈیا سے بھی وابستہ رہی ہیں۔ اُن کی متعدد شعری و نثری کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں جسے قارئین پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُن کی سوچ اور فکر دیگر مہجری افسانہ نگاروں کی روش سے ذراہٹ کر ہے۔ وہ اپنی کہانیوں کا تانا بانا دو تہذیبوں کے تجربات و مشاہدات سے بُنتی ہیں۔ انہوں نے ہجرت کے موضوع پر بھی قلم اُٹھایا ہے جس میں اُن کے افسانے ''ہجرت'' اور ''مجبورِ سفر ہوں'' کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ مشرقی تہذیب و تمدن، مذہب سے لگاؤ، سماجی رشتوں کی بے رُخی ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہے۔ ان کے موضوعات میں شعور و تحت الشعور کی رو کافی تیز دکھائی دیتی ہے۔

رضیہ کاظمی کا شمار اُن نامور افسانہ نگار خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے بڑے موثر انداز میں انسانی نفسیات اور جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ وہ بنیادی طور پر شاعرہ ہیں۔ اُن کے دو شعری مجموعے ''صد پارہ ہائے دل'' اور ''لخت ہائے دل'' شائع ہو چکے ہیں۔ افسانہ نگاری کے فن میں انہوں نے ایک نئی طرح نکالی ہے جس میں معاشرے کے پسے ہوئے طبقے اور خاص طور پر بچوں کی نفسیات کو موضوع بنایا ہے۔ ان دنوں وہ یو ایس اے میں مقیم ہیں۔ وطن پرستی کے جذبات اور دھرتی ماں سے محبت اُن کے افسانوی آہنگ میں پوشیدہ ہے۔ ان کے افسانے ایک جانب کردار نگاری کی عمدگی اور منظر کشی کے احوال میں فنی پختگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں وہیں پر مغربی و مشرقی سماج کی نفسیاتی جہت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ اس تجزیے کی ''لَے'' اور غنائیت و موسیقیت میں شعور کا ادراک بڑا سیدھا سادہ اور ایسے غیر متوقع امتزاج کا حامل ہے کہ ایک معمولی سے واقعہ یا ماحول کی ریزہ کاری سے ادبی فضا قائم کر دیتا ہے۔ تیسری دنیا کا یہ مہجری افسانوی انداز نے جذباتی کھنچاؤ، کشمکش اور کلائمکس کے عروج و منتہا پر بڑے فنکارانہ عمل کی مرقع کشی کرتا ہے۔ ''عزت'' ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار کی شخصیت کا نفسیاتی اظہار پنہاں ہے۔ اس افسانے میں ماضی و حال کی کیفیات کا شعوری اظہار جاوداں ہے۔ افسانہ نگار نے ایک جانب اس سوچ کی کار فرمائی دکھائی ہے جس میں پستے ہوئے طبقے کی محرومی اور ناتمام تمناؤں کی لالہ کاری کی گئی ہے تو دوسری طرف اُن معاشرتی احوال کا بیان ہے جو انسان کو اخلاقی اقدار اور مساوات کا علمبردار قرار دیتی ہے۔ مذکورہ افسانہ ''عزت'' ایک ایسے معاشرے کی کہانی ہے جو شان و شکوہ کی زندگی بسر کر رہا ہے مگر اس کے

ماضی اور حال میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ ایک ایڈووکیٹ گھرانے کی اندرونی قصے پر محیط ایک افسانہ ہے۔ پورا افسانہ شکور احمد ایڈووکیٹ اور اس کی اہلیہ کے کردار کے ارد گرد بُنا گیا ہے۔ شکور احمد عرف شکورا اپنے بچپن میں ایک ایسی زندگی کے لمحات گزار چکا ہے جس میں اُسے ایک زمیندار سکندر کے گھر میں ملازم کی حیثیت سے رہنا پڑا۔ اُسے معلوم تھا کہ کسی کے ہاں نوکر کی حیثیت سے زندگی گزارنا اور وہ بھی کم سنی میں اور اس کم سنی میں غیروں کے طعنے سننا کتنا دردناک ہوتا ہے۔

شکورا اور نصیبن دونوں ایک زمیندار گھرانے میں نوکر کی حیثیت سے رہنے پر مجبور تھے۔ رضیہ کاظمی نے ان کے کرداروں کی معصومیت اور ان کے عمل اور ردِ عمل کے ذریعے سے زندگی کے بڑے سُلگتے ہوئے ناسور کی شدت کو کمال مہارت سے افسانوی لب ولہجہ میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے کم سنی میں اُن بچوں کو گھریلو ملازم کی حیثیت سے مشقت کا بار اُٹھانے کا نقشہ کھینچا ہے جس میں انہیں بچوں کو بہلانے سے لے کر بیت الخلا کی صفائی ستھرائی تک کے کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔ مغربی معاشرے میں چائلڈ لیبر کے قوانین موجود ہیں مگر مشرق میں قوانین تو ہیں لیکن عمل درآمد نام تک کا نہیں۔ افسانہ ابتدا ہی سے قاری کو اپنے حصار میں جکڑ لیتا ہے۔ یتیمی کا غم اور والدین کی جدائی انسان کو لاوارث بنا دیتی ہے۔ اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے یہ کٹھن لمحات بسر کیے ہوں۔ یہی وہ احساس ہے جو شکورے کے شعور وادراک میں شدت کے ساتھ اُبھرتا رہتا ہے۔ جب بھی وہ کسی بچے کو اس حالت میں دیکھتا ہے تو اُس کی روح کانپ اُٹھتی ہے۔ اس طرح سے وہ ماضی کے اندوہ ناک واقعات میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ چناں چہ رضیہ کاظمی نے فلیش بیک کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے معاشرتی شعور کی عکاسی کی ہے۔ وہ ایک ماہرِ نفسیات کی مانند کرداروں سے گفتگو کرواتی ہیں۔ بیان کرتی ہیں:

> ”قدرت کسی بچے کو یتیم نہ کرے۔ شعور بیدار ہوتے ہی شکورے نے خود کو لاوارث پایا۔ اس نے اپنے چاروں طرف زمیندار سکندر بخت اور اس کی بیوی بچوں کو دیکھا: زمیندار صاحب ظلم، سفاکی اور بے رحمی میں یکتا روزگار تھے۔ شکورا ان کے ایک کاشتکار کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب ایک وبائی بیماری میں اس کے ماں باپ دونوں کھو گئے تو سکندر صاحب نے اسے اپنے گھر میں رکھ لیا تا کہ وہ باہر کا سودا سلف با آسانی لا سکے۔“(۵)

رضیہ کاظمی یو ایس اے میں مقیم ہوتے ہوئے مشرقی رسم و رواج اور بورژوا طبقہ کے استحصالی نظام کو نہیں بھولیں۔ ان کا افسانہ ”عزت“ بورژوا طبقہ کے ظلم و ستم کی روداد کے طور پر سامنے آتا ہے جہاں بچوں سے محنت و مشقت کے کام لیے جاتے ہیں۔ وہ زمانہ جو ان کے بچپن میں کھیل کود کا ہوتا ہے۔ وہ حالات کے مارے ان زمینداروں کی سفاکی اور جبریت و بے رحمی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ بعض دفعہ ایسے بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ بچے جن کے والدین اُن کے بچپن میں اس دارِ فانی سے کوچ کر جاتے ہیں وہ اس مقدس رشتوں سے بھی بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ اُن کی معصومیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ”نوکر“ جسے چہار حرفی لفظ کا فہم تک نہیں سمجھ پاتے۔ شکورا بھی ایک ایسا ہی مشرقی معاشرے کا کردار ہے جو پلا بڑھا تو زمیندار کے بچوں کے ساتھ تھا مگر اس کو وہ وقار اور سماجی اقدار نہ مل سکیں جس کا وہ حقدار تھا۔ اس کا شعور ہمیشہ اُسے اس بات کی طرف مائل رکھتا کہ وہ بھی میڈم کے بچوں کی طرح ایک انسان ہے، اُس کے بھی ہاتھ پاؤں، آنکھ، ناک سب انہی کی طرح ہیں تو وہ نوکر کیسے اور کیوں کر ہوا؟ کاظمی صاحبہ اس نفسیاتی پہلو کا اظہار ان کلمات میں کرتی ہیں:

> ”ہائیں! کمبخت! تو نوکر ہو کر میرے بچوں کی برابری کرنے چلا ہے“
>
> زمیندانی دہاڑیں۔ وہ ڈر کر اُٹھا، ان کا حکم تو بجالایا لیکن یہ چہار حرف لفظ نوکر اس کے دماغ میں کئی دنوں تک گھومتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میڈم کے بچے بھی بالکل میرے ہی طرح ہیں۔ میں کیوں نوکر ہوں اور وہ کیوں نہیں ہیں۔ میرے ہاتھ پاؤں، آنکھ، ناک سب انہی کی طرح ہیں تو میں کیوں نوکر ہوں؟
>
> ایک دن احمر کے ساتھ پڑوس کے چند بچے کھیلنے آ گئے تو وہ ان سے پوچھ بیٹھا۔ ”کیا تم نوکر ہو؟“
>
> ”خدا نہ کرے“ ان بچوں نے جواب دیا۔
>
> ”تو پھر کمبخت ہو“ وہ ان سے پوچھ بیٹھا۔ کچھ بچے اُسے مارنے دوڑے لیکن انہی میں ایک نے سب کو روکا۔
>
> ”کمبخت ان کو کہا جاتا ہے جن کے ماں باپ مر گئے ہوں“ اسی نے شکورے کو سمجھایا۔
>
> ”کوئی مرتا کیوں اور کیسے ہے؟“ پانچ سالہ شکورے نے معصومیت سے پوچھا۔

”اچھے لوگوں کو جسے سب پسند کرتے ہیں اللہ بھی پسند کرتا ہے اور اپنے پاس بلا لیتا ہے۔

بس اسی کو مرنا کہتے ہیں۔“

”کیا مجھے اللہ میاں کے گھر جانے کا راستہ بتا دوگے شمشیر بھیا؟“

”نہیں شکورے وہاں کو رستہ کوئی نہیں جانتا“

تو میرے اماں ابا کدھر سے گئے؟“(۲)

رضیہ کاظمی نے شکورے کے کردار کے ذریعے سے شدتِ جذبات، بچوں کی معصومیت، نفسیات اور اعصابی کشمکش کو تھوڑے سے لفظوں میں بیان کر کے جس انداز سے تاثر آفرینی کی فضا پیدا کی ہے۔ اس فضا میں ہمارے معاشرے کے بچوں کی سادگی اور ماحول کی کرختگی نمایاں ہے۔ شکورے کے دل میں اللہ میاں کے گھر سے بلاوے کے لیے شدید انتظار کرنا اس کی معصومانہ شدتِ جذبات کا ہیجانی اظہار ہے۔ بیان کی یہ شدت زندگی کی ٹریجڈی کا تلخ احساس ہے۔ جذباتی شدت اور فضا کی تلخی کو نمایاں کرنے کی خاطر کاظمی صاحبہ نے سادگی بیان اور شعور کی خصوصیت سے کام لیا ہے۔

ان کے افسانوں کے معمولی واقعات بھی پڑھنے والوں کو بڑی تیزی سے پورے واقعات کے تند و تیز جھروکوں میں بہا کر لے جاتے ہیں۔ شعور کی رو شروع سے آخر تک اپنا تسلسل قائم کیے رکھتی ہے۔ افسانے کے آغاز سے لے کر انجام تک ان دونوں مرحلوں کے درمیان میں افسانہ نگار کو جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے وہ اگر ان میں سے کسی ایک کی اہمیت کی طرف سے بھی غفلت یا بے نیازی برتے تو افسانہ کی مجموعی تاثیریت میں بگاڑ پیدا ہو جائے۔ کاظمی صاحبہ کو اس فطری تاثر آفرینی کی فضا کو جاوداں رکھنے کی خاطر اُن تمام مراحل سے گزرنا پڑا۔ انہیں احساس تھا کہ قصہ پن کے واقعات خونِ جگر کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن کا ہر افسانہ آغاز سے انجام تک بعض واضح مرحلے طے کرتا ہوا اپنے منطقی انجام کے منتہا تک پہنچ کر دم لیتا ہے۔ اس انجام میں شعور کی رو پڑھنے والے کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چناں چہ قاری ایسے محسوس کرنے لگتا ہے جیسے یہ سب کچھ اس کے اپنے اوپر بیت رہا ہو۔

ہجرت کا کرب اور اپنے گھر سے دوری کا اندیشہ، بے سروسامانی، خستہ سامانی کی کیفیات اور پھر ماضی کی یادوں کے دھندلکے جابجا اپنے اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ بچہ جو ایک زمانے میں خود ”نوکر“ بن کر زمیندار سکندر بخت کے ہاں پناہ گزیں تھا، سخت مشقت، دربدر کی ٹھوکریں، آٹو رکشہ کی اسٹیرنگ پر چلتے چلتے میں حال کے شکور احمد ایڈووکیٹ اور تعلیم کا چکر بھی ماضی کا شکورے کے حال کے شکور احمد ایڈووکیٹ بن جانے میں مددگار ثابت ہوا۔ بچپن میں زبان کی نقل بندی کھلی تو عدالت میں زبان کے وہ جوہر دکھائے کہ فریق مخالفت کو بغلیں جھانکنے پر مجبور ہونا پڑا۔ سچ کہتے ہیں جب قسمت بدلتی ہے تو وہ سب کچھ نصیب ہو جاتا ہے جسے عام طور پر معاشرے کی خوش نصیبی تصور کیا جاتا ہے۔ معاشرے میں ایسے بہت سے لوگ ہوں گے جن پر قسمت مہربان ہو گئی۔ کتنے ہوں گے جو اس امارت کو ہضم کر سکے ہوں گے اور نہ جانے کتنے لوگ دیکھنے میں آتے ہیں جنہوں نے حالت بدلتے ہی رشتوں ناتوں کا بھرم کھول کر رکھ ڈالا۔ شکورے کی زندگی بھی ان دونوں کے معاشرتی سماجیت کے بیچوں بیچ بسر ہوئی۔ اسے کامیابی نصیب ہونے کے بعد اپنی گرہستی میں کئی شکوروں کو لانا پڑا ہو گا۔ شکورے اور شکور احمد کی خلیج پاٹنی پڑی ہو گی۔ اب حالات نے ایک نئی کروٹ بدلی وہ شکورا جو پہلے خود نوکر تھا اب اس کی جگہ ”نوراں“ نے لے لی ہے۔ اس کی خستہ سامانی اُس کے ماحول کی پروردہ ہے۔ ”نوراں“ وادیٔ کشمیر میں ایک غریب اور مفلس الحال خاندان کا استعارہ ہے جس کی صورت حال برسوں سے جوں کی توں ہے۔ غریبی اور بے چارگی اس خطۂ ارضی کی آماجگاہ بن چکی ہے۔ کاظمی صاحبہ نے جہاں ماضی میں شکورے کے ذریعے سے بچوں کی نفسیات کو پیش کیا جو خستہ سامانی کا شکار تھے تو حال میں ”نوراں“ لڑکی کے کردار کے ذریعے سے مشرقی دنیا کے حالات کو سامنے لانے کی جستجو کی ہے جو زمانہ گزرنے کے بعد بھی ویسے کی ویسے ہی ہے۔ اُن میں کوئی تبدیلی نمو پذیر نہ ہو سکی۔ پھر سے اُسی بورژوا اور استحصالی نظام کی اجارہ داری قائم ہے۔ وہی بالادست طبقہ معاشرتی استحصال پر کمر باندھے کھڑا ہے۔ اس کا احساس ایڈووکیٹ شکور احمد کو اندر ہی اندر سے کھائے جاتا ہے۔ اگرچہ اُس کے حالات بہتر ہو چکے ہیں مگر اس کے باوصف وہ چاہتے ہوئے بھی معاشرتی خرافات کو بدل نہیں سکتا۔ اس کی مصوری رضیہ کاظمی ان الفاظ میں کرتی ہیں:

”ہر سال گرمیوں میں جب ہائی کورٹ بند ہوتا تو وہ کسی نہ کسی پہاڑی مقام پر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ضرور جاتے۔ اس سال انہوں نے کشمیر جنت نظیر جانے کا پروگرام بنایا۔ کئی ماہ پیشتر ہی ایک چھوٹا سا بنگلہ کرایہ پر لیا جا چکا تھا۔ کشمیر ایک طرف قدرت کی فراواں اور گوناگوں ضیافتوں کا خزینہ ہے تو دوسری جانب مفلسی اور غربت کی آماجگاہ بھی۔ دو کتوں کے درمیان ہڈی بن جانے کے سبب اکثر شاہ پسند قالینوں، شالوں، نمدوں اور خوبصورت پشمینہ و فر کا سامان بنانے والے ماہر فنکاروں کے پیٹ خالی اور تن ننگے

رہتے ہیں لہذا ایڈووکیٹ صاحب کو نوکر ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ نوراں ایک ٹٹّو والے کی لڑکی تھی۔ حالانکہ آج کل کمائی کا سیزن تھا لیکن اکثر اولاد کی وجہ سے آمدنی اٹھنی خرچہ روپیاوالا معاملہ تھا۔ اس لیے وہ سیزن میں آنے والوں کے یہاں گھریلو کام بھی کرتی تھی۔ بنگلہ میں پانی کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ تھوڑی دور پر گرتا ہوا جھرنا ہی آس پاس کے بنگلوں کے لیے ذریعہ آب تھا۔ یہ کافی نشیب میں واقع تھا۔ گھر کے دوسرے کاموں کی انجام دہی کے بعد نوراں کا اہم کام پورے گھر کے پانی کی ضرورت کو پورا کرنا تھا۔ وہ جھرنے تک پہاڑی بکریوں کی طرح کودتی پھاندتی جاتی اور اس طرح پانی لے کر واپس آتی۔"(۷)

یہاں پر انہوں نے خطہ کشمیر اور وہاں کے لوگوں کے حالات اور اُن کی نفسیات کو بڑے واشگاف انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے افسانے کو بڑی دھیمی لیکن نپی تلی چال سے بڑے نرم لیکن توانا قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھایا ہے۔ جوں جوں افسانہ آگے بڑھتا ہے پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر اس کا نقش زیادہ مستحکم اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی دھیمی اور نپی تلی رفتار سے افسانہ اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ افسانے کے ہر مرحلے پر ساتھ دینے والا قاری سفر کے اختتام تک ایک طرح کا سکون، ایک طرح کی مسرت محسوس کرتا ہے۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے کوئی بہت بڑا سفر طے کرلیا ہے اور بڑی کامیابی سے طے کیا ہے۔ ایک ایسی کامیابی جو یوں ہی اتفاقاً ہاتھ نہیں آتی بلکہ اس میں لکھنے والے کی سوچ وچار کا عمیق اثر ہوتا ہے۔ کاظمی صاحبہ افسانہ "عزت" کے ذریعے سے زندگی کی اونچ نیچ کے تمام معیارات گرا کر ایک ایسی دنیا کی متلاشی ہیں جس میں تمام انسانوں کے ساتھ مساوی برتاؤ کیا جائے۔ ہر ایک کو زندگی کی خوشیاں لوٹنے کا اتنا ہی حق ہو جتنا کہ کسی امیر شخص یا باحیثیت معاشرے کے باشندوں کو۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شکورے کے ذریعے سے ایک امیر کبیر عورت کو "نوراں" ایک غریب لڑکی سے معافی مانگنے کا حکم صادر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ مجھ سے کوئی غلط کر بیٹھیں تو کیا کبھی کوئی معافی نہیں مانگے گی؟ یہاں پر مصنفہ کے انداز میں مغربی سوچ اُبھر آتی ہے۔ جہاں گناہ یا غلطی سرزد ہونے پر معافی مانگ لی جاتی ہے۔ لوگوں کو مساوی حقوق دیئے جاتے ہیں۔ اس کا اظہار افسانے کے اختتام پر اس عمدگی کے ساتھ کیا گیا کہ ماضی وحال کی کڑیوں کے ربط کی اس جھنکار کے احساس نے زندگی کے اُتار چڑھاؤ کی پوری داستان چند لفظوں میں بیان کر دی ہے۔ چوکیدار کی زبان سے "نوراں" کے کہے ہوئے لفظ "عزت" سنتے ہی شکورا اور اس کی اہلیہ دونوں ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ افسانہ نگار نے اس کی عمدہ منظر کشی کی ہے:

"تو میں آج آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آج کی نوراں کے حال اور میرے ماضی کی حیثیت میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ میں بھی پہلے وہی تھا جو آج نوراں ہے۔ اچانک اس انکشاف سے بیگم بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔ شوہر نے انہیں سنبھالا دیا۔ اسی دوران چوکیدار نے اطلاع دی کی نوراں تڑکے ہی مجھ سے یہ کہہ کر اپنے گاؤں واپس گئی کہ وہ اب میدان والوں کی نوکری نہیں کرے گی۔ "عزت" ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے۔"(۸)

رضیہ کاظمی نے افسانے کے کرداروں کی ذہنی کیفیتوں کو ایک لفظ "عزت" کے ذریعے سے ایسی دلکشی بخشی ہے کہ معاشرے کے بالا طبقہ کے لوگ نگاہیں چرانے لگتے ہیں۔ انہیں ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے اُن کا حقیقی روپ ہے۔ انہوں نے سماج کی اخلاقی قدروں کے دائرہ کار میں لاشعور کی تہوں میں معاشرے کے اُن افراد کے جذبات کی ترجمانی کی ہے جن کی سسکتی تمنائیں، مریض خواہشیں جنہیں شعور نے سرخ آنکھیں دکھا دی تھیں اور انہوں نے لاشعور کی تاریک تہوں میں پناہیں لیں۔

ماہرینِ نفسیات کے مطابق انسانی ذہن چند حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر حصہ اپنے ننھی سی دنیا میں اپنا کام کرتا ہے لیکن اس کی علیحدگی کے باوجود یہ حصے ایک دوسرے سے مل کر رہتے ہیں جن سے ایک تسلسل قائم رہتا ہے۔ ان حصوں کو اِڈ، ایغو اور سُوپر ایغو کہتے ہیں۔ رضیہ کاظمی نے اپنے افسانوں میں قوتِ متخیلہ اور نفسیات کے مذکورہ تینوں حصوں کو کمال مہارت سے برتا ہے۔ ان کے افسانے شروع سے آخر تک چھوٹی بڑی باتوں کو سموئے ایک زنجیر بنائے سامنے آتے ہیں۔ انسان کی خارجی دنیا کو باطن کی دنیا سے پیوست کرنے کی جسارت کی گئی ہے۔ انسان کا شعور وادراک ہر وقت بچے کی مانند نہیں رہتا۔ وہ بڑھتا ہے اور جیسے جیسے اُس کے شعور میں پختگی آتی جاتی ہے اُس کی شخصیت میں نکھار آتا جاتا ہے۔ چناں چہ ایغو اور سُوپر ایغو خارجی دنیا اور ماحول کے ساتھ انسان کے تعلقات قائم کرنے کا موجب بن جاتی ہیں۔ اخلاق اور تہذیب اس کے بندھن کو ایک رشتے میں استوار کر دیتے ہیں۔

جدید ترین افسانوں میں جو تجریدیت کا پہلو در آیا ہے اس کا مطالعہ بھی لاشعور کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ اب افسانہ نگار خود کو واقعات کے فریم اور کرداروں کے افعال کے پابند نہیں بناتے بلکہ ان سے آزاد ہو کر تلازمے سے خود کو دھیان کی لہروں پر آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ اس سے واقعات کو باہم

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

مربوط کرنے والی کڑیاں ٹوٹتی جاتی ہیں جس سے افسانے میں تجریدیت پیدا ہو جاتی ہے۔" تحلیلِ نفسی کے زیرِ اثر سوریلزم کی ادبی تحریک نے جنم لیا تھا۔ اس تحریک سے متاثر ہو کر لکھے جانے والے افسانے انسان کی ان لاشعوری کیفیات کے غماز یا ترجمان ہوتے ہیں جن کا اظہار خوابوں سے ہوتا ہے۔ خوابوں کا اظہار علامت کی زبان سے ہوتا ہے"(۹)۔ اس لیے اس نوع کے افسانے بھی علامت کو وسیلۂ اظہار بنائے ہوئے سامنے آتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ علامات کی تلاش میں افسانہ نگاروں نے قدیم داستانوں، مذہبی صحائف اور اساطیر تک سے رہنمائی حاصل کی ہے۔ چناں چہ مہجری ادب کی مشہور افسانہ نگار صفیہ صدیقی کا تعلق علامتی نفسیات پر مبنی افسانہ کی قبیل سے ہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے "پہلی نسل کا گناہ" اور "چاند کی تلاش" شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا آبائی وطن لکھنؤ تھا۔ تقسیمِ ہند کے بعد وہ ہجرت کر کے پاکستان آئیں اور شادی کے بندھن میں بندھنے کے بعد نئے خوابوں کی تعبیر میں لندن میں سکونت پذیر ہو گئی ہیں۔

صفیہ صدیقی کے افسانے سمبلزم کے تحت روزمرہ کی زندگی میں اپنے اظہار کے لیے غیر شعوری طور پر علامت کا سہارا لیتے ہیں۔ چناں چہ ان کا اسلوبِ بیان رومانس، ماضی پرستی اور غم کی روداد کا پیکر بن کر سامنے آتا ہے جس سے کسی مہاجر کو مفر نہیں ہے۔ ان کے افسانوں میں برطانیہ کی معاشرتی زندگی کا رنگ چڑھا سامنے آتا ہے۔ اُس معاشرت کی جھلکیاں ہیں جس میں صرف انگریزی طبقہ ہی نہیں بلکہ مشرقی مزاج و زبان کے لوگ بھی رہتے ہیں مگر ان دونوں طبقوں کو ایک جیسے المیہ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے دونوں نے تہذیبی و سماجی اقدار اور رسم و رواج کے اعتبار سے ایک دوسرے کا دامن تھام رکھا ہے جو انہیں ورثہ میں ملی ہیں۔ نتیجتاً تہذیبی اقدار اس کی معاون بنتی ہیں اور وہ اپنے احساسِ غم پر قابو پا لیتی ہیں۔ صفیہ صدیقی نگاہِ دوررس کی حاملہ افسانہ نگار ہیں جو اس معاشرے کا بغور مشاہدہ کرتی ہیں اور پھر اس کو اپنی تجربیت کے ذریعے سے افسانونی روپ میں ڈھال دیتی ہیں۔ محمود ہاشمی ان کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "وہ اپنے مشاہدہ کو "دو عورتیں" کا عنوان دے کر افسانہ کے روپ میں اس طرح ڈھالتی ہیں کہ وہ اُن کے کمالِ فن کی دلیل ہے اور ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کے لیے دعوتِ فکر بھی! وہ نسل جو سات سمندر پار کر کے برطانیہ میں اپنی بستیاں بسا رہی ہے۔ معاشرہ کے اُس "قرض" کے احساس سے اپنی جان کو عذاب میں مبتلا کے ہوئے ہے جو وطنِ عزیز سے روایات اور اقدار کی صورت میں لائی تھی۔ جس کے بنائے ہوئے اصولوں کو قائم رکھنا وہ اپنا فرض سمجھتی ہے لیکن نئی جوان ہوتی ہوئی نسل، اُن کی اولاد نے اپنے اوپر ایک اور طرح کا "قرض" عائد کر رکھا ہے اور یہ ہے مغربی معاشرہ کا قرض۔ اس وجہ سے احترام کہ اس نے انہیں اور ان کے والدین کو اپنایا ہے۔ تاہم وہ اندھی تقلید کی قائل نہیں اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنا چاہتی ہے۔"(۱۰)

افسانہ "قرض" میں جب شبانہ ایک امریکی سے شادی کرتی ہے تو ماں باپ کے چہرے سپاٹ اور مسکراہٹیں غائب ہو جاتی ہیں۔ وہ اس بات کو دلی طور پر تسلیم نہیں کرتے۔ اُن کی روایات اور مذہب انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا مگر ایک دوسری تصویر بھی ایک نئے پہلو کو سامنے لاتی ہے کہ شبانہ کے کزن ارشی کا دوست "کرسٹوفر" مسلمان ہو کر ارشی کی بہن صبا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی اس خواہش کا اظہار صبا سے نہیں کرتا بلکہ مشرقی روایات و اقدار کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے صبا کی ماں سے اس کا رشتہ مانگتا ہے۔ صبا کی ماں کو یہ رشتہ پسند ہے مگر دونوں کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے جو اُن کی ایک نسل کا دوسری نسل سے تعصب کو پیش کرتا ہے۔ چناں چہ "قرض" علامت ہے اُن دو تہذیبوں کا جو ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں مگر دونوں کی ایک دوسرے سے کچھ توقعات وابستہ ہیں۔ صفیہ صدیقی ان توقعات کو ایک قالب میں ڈھالنے کی کوشش میں ہیں۔ ان کے ہاں مغربیت بھی ہے اور مشرقیت بھی، اپنائیت بھی ہے اور بیگانگی بھی۔ اس سے قُرب اور دوری بھی، پسند اور ناپسند اور تعصب پرستی کے گوناگوں انداز وابستہ ہیں۔ اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

> "وہ خود تو اکثر کرس کے لیے وہی مامتا محسوس کرتیں جو ارشی کے لیے ان کے دل میں تھی لیکن کرس کو ممّی سے جو محبت تھی کبھی انہیں اس کا احساس ہوتا تو ان کا دل پگھل کر ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ کرس والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے ماں باپ دونوں ملک کے علمی حلقے میں ممتاز تھے، اہم منصب پر فائز۔ اہم کاموں میں مصروف کرسٹوفر کی زندگی پہلے گورنس کی زیرِ تربیت گزری پھر بورڈنگ سکول میں داخل ہو گیا۔ چھٹیوں میں جب وہ گھر آتا تو بھی والدین سے شاذ و نادر ہی ملاقات ہوتی۔۔۔۔ اور جب ایک دفعہ اس کے والدین ایشیا اور افریقہ کے دورے پر گئے تو وہاں انہوں نے زندگی کا اصل رُخ دیکھا۔ افلاس و غربت کی انتہا دیکھی اور ظلم و ستم کی انتہا بھی۔ اس دورے سے ان لوگوں پر یہ اثر ہوا کہ انہیں اپنی تعلیمی و تدریسی کوششیں بیکار معلوم ہوئیں۔۔۔۔ انہوں نے

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

اپنی نوکری چھوڑ دی اور ایک فارم خرید کر اس میں کاشت کاری کرنے لگے۔ سائنس نے اب تک جو ترقی کی تھی وہ سب بے کار تھی، وہ بھی اس طرح محنت کر کے زندگی گزارنا چاہتے تھے جس طرح سے ایک عام کسان رہتا ہے۔"(۱۱)

اس صدی کے آغاز میں انگریزی کے مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس کپلنگ نے لاہور میں بیٹھ کر ہمیں اپنے مشہور کردار "کم" سے روشناس کروایا تھا۔ اب اس صدی کے اختتام پر لندن میں مقیم صفیہ صدیقی ہمیں "کرسٹوفر" کے کردار سے روشناس کروا رہی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کپلنگ کا "کم" سیاست، تہذیب اور سماج کے کئی پُر پیچ بندھنوں سے آزاد ہو کر وقت کے طول و طویل فاصلے طے کر کے ایک نئی شخصیت کے روپ میں ڈھل گیا ہے۔ کہیں کل کا "کم" آج کا "کرسٹوفر" تو نہیں ہے۔ کپلنگ نے کہا تھا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ یہ دونوں کبھی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں مل سکتے۔ مگر صفیہ صدیقی کے افسانہ "قرض" کے مطالعہ سے احساس ہونے لگتا ہے کہ مشرق اور مغرب کے نہ صرف جغرافیائی فاصلے سمٹ رہے ہیں بلکہ ذہنوں میں بھی انقلاب آرہا ہے۔ اگرچہ یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر ہی سہی، بے دلی سے ہی سہی مگر بیگانگی اور اپنائیت کے زاویے بدل رہے ہیں۔

صفیہ صدیقی کے افسانوں میں انفرادیت، اُن کے دلنشین اسلوب میں پنہاں ہے۔ وہ منظر کشی اور فضابندی کا ملکہ رکھتی ہیں۔ ان کے ہاں عجیب و غریب کردار نہیں بلکہ مشرق و مغرب دونوں کے امتزاج سے منسلک کردار ہیں۔ ان کرداروں کی نفسیات کی آگاہی افسانوں میں جاذبیت کی فضا پیدا کر دیتی ہے۔ اُن کے کردار مذہبی قید سے ماورا تخیلاتی دنیا سے دور اسی جیتی جاگتی دنیا کے باسی ہیں۔ رشتوں کی تلاش ایک درد بھرا عمل ہے مگر ہمارے زمانے میں شاید یہ زیادہ ہی پیچیدہ اور کرب ناک ہو گیا ہے۔ مولانا حالی اور اُن کے بعد اقبالؔ نے مسلمانوں کی تاریخ کو پورا حوالہ جانا اور اس بنیاد پر ماضی سے رشتہ قائم کیا۔ اس کے بعد میراجی آئے جنھوں نے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ میں تو آریائی ہوں اور ہندو دیومالا میں اپنی جڑیں تلاش کیں۔ اس عہد کے لکھنے والوں پر یہ کھلا کہ خون مکمل حقیقت نہیں ہے اور مذہبی عقیدہ غالب حقیقت سہی مگر پوری حقیقت وہ بھی نہیں ہے۔ بہت سے رشتے آپس میں گھل مل کر ذات کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ آگہی موجودہ عہد کے مہجری افسانہ نگاروں کے احساسِ ماضی کو مولانا حالی اور اقبالؔ کے احساسِ ماضی سے اور دوسری طرف میراجی کے احساسِ ماضی سے الگ کرتی ہے اور اسے مخصوص طور پر اس عہد کا احساسِ ماضی بناتی ہے۔ صفیہ صدیقی کے ہاں بھی اس ماضی کی تلاش ہے۔ اُن کا افسانہ "دل کی گرہ" میں معاملاتِ دل کا عکس پیش کیا گیا ہے۔ مشرق میں بیتے ہوئے ماضی کا ایک باب دفعتاً مغرب میں بسر ہونے والے "حال" میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ مشرق کی جذباتی دنیا مغرب کی حقیقت پسندی سے آنکھیں چار کرتی ہے۔ اس کی مصوّری انہوں نے یوں کی ہے:

> "میں بھی ساری پرانی باتیں یاد کرتا رہا۔۔۔ وقت کے ساتھ انسان کتنا بدل جاتا ہے کہ کبھی کبھی شدید قسم کی خواہش ہوتی ہے کہ وقت پیچھے کی طرف لوٹ جائے، جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے اسے واپس دے کر اس کے بدلے میں اپنی کم علمی، کم عقلی حاصل کر لوں۔ مجھے اپنے دوست، اپنی فضا، اپنا ماحول مل جائے اور سب سے بڑی بات ہے میرے خواب مجھے مل جائیں۔۔۔ صبّو۔۔۔ انسان خوابوں کے بغیر خالی خالی سارہ جاتا ہے۔۔۔ کھوکھلا۔۔۔ ایک زندہ مشین۔ جب انسان کے دل میں تمنائیں، اُمیدیں کروٹیں نہیں لیتیں تو اس کے جذبات منجمد ہو جاتے ہیں اور زندگی تو حرارت میں مضمر ہوتی ہے۔ زندہ رہنے کے لیے خواب بہت ضروری ہیں۔"(۱۲)

انہوں نے ایک ایسی دنیا تخلیق کرنے کی جستجو کی ہے جس میں واقعاتی اور امکانی صداقتوں کی آمیزش سے تاثر آفرینی کو چوکھا کیا گیا ہے۔ یہ اُن کے تخیل اور نفسیاتی عمل کی کارفرمائی ہے کہ قاری کو ہر وقت کسی نہ کسی غیر متوقع صورتِ حال کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ ان کے افسانوں میں چونکا دینے والی فضا سحر آفرینی کرتی سامنے آتی ہے۔ خوف انسان کی جبلت ہے۔ ان کے فن کو اسی انسانی جبلت کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ صفیہ صدیقی کی افسانہ نگاری میں ایک نفسیاتی افادیت کا پہلو پایا جانا فطری امر ہے۔ ان کے افسانوں میں ماحول کی بندش اور حیرتوں کا اظہار انسانی ذہن کے نادیدہ گوشوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ جدید افسانہ نگاری کی تکنیک میں جو انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں وہ نفسیاتی جہت کی مرہونِ منت ہیں۔ "نفسیات نے افسانہ کی تکنیک یا ہیت کو نہیں بدلا۔ اس کا مرکزی خیال اور وحدتِ تاثر جوں کی توں قائم رہے گی لیکن اس کے موضوع اور تفاصیل میں بے حد اضافہ اور تنوع پیدا ہو گیا ہے"(۱۳)۔ جب کہ غلام حسین اظہر اپنے مقالے "اُردو افسانے کا نفسیاتی دبستان" میں لکھتے ہیں:

> "لاشعور کی دریافت، جبلتوں کی غیر معمولی اہمیت، جسمانی تقاضوں کی بالاتری اور انسانی شخصیت کے بالکل نئے تصور نے ادبی تحریروں میں کردار نگاری کے انداز کو بھی بدل دیا ہے اور پلاٹ کی نسبت کردار نگاری کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ کردار نگاری میں بھی

JAHAN E TAHQEEQ
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

فرد اور سماج کے تصادم سے زیادہ داخلی کش مکش کی طرف توجہ دی جانے لگی ہے اور داخلی کش مکش کو بے نقاب کرنے کے لیے نت نئے تجربے ہو رہے ہیں۔"(۱۴)

صفیہ صدیقی کے افسانوں کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے افسانوں میں جہاں پلاٹ کی بندش کی گئی ہے وہیں پر کرداروں کی نفسیات کی بدولت پلاٹ کو آگے پھیلایا گیا ہے جس پر قصے کی تاثر آفرینی جلوے بکھیرنے لگی ہے۔ ان کے افسانوں میں داخلی و خارجی کش مکش میں اُن کے شعور و وجدان کا ادراک کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک اور چیز نے ان کے افسانوں کو ہر دل عزیز کیا ہے وہ ہے رومانی اسلوبِ بیان اور حقیقت پسندی کا رجحان۔ ان دونوں کی آمیزش کے ذریعے سے کردار ایسی سحر آفرینی برپا کرتے ہیں کہ قاری اس کی رو میں بہہ نکلتا ہے۔ زبان و بیان کی ندرت اور افسانہ شناسی کی صلاحیت ان کے اندر بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ رومانیت اور حقیقت کی لہریں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو جاتی ہیں۔ ان کا افسانوی لب و لہجہ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے الگ تھلگ ہے۔ افسانوں کی فضا ایک پُراسرار دھندلکے میں ڈوبی پورے منظر کو معطر کر دیتی ہے مگر اس دھندلکے میں اپنے وقت کی تلخ، ترش اور اذیت ناک حقیقتیں رہ رہ کر اس طرح اُبھرتی ہیں جس طرح گھٹاٹوپ اندھیرے میں بجلی بار بار لہرا اُٹھے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ ان کے ہاں فضا کتنی ہی گہری، پُراسرار اور دہشت ناک ہی کیوں نہ ہو وہ روزمرہ زندگی سے آنکھیں بند نہیں کر لیتی بلکہ وہ اپنے تخیل سے حقیقی زندگی کا ایسا تانا بانا بُنتی ہیں جس کا عکس ان کے افسانے "پہلی نسل کا گناہ" کی صورت میں سامنے آتا ہے:

"موسم خزاں شروع ہو چکا ہے۔ اُس نے اُکتائی ہوئی نظروں سے اردگرد دیکھتے ہوئے اپنی کرسی اس سمت کو کھسکائی جس طرف دھوپ سرک رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت غائب ہو چکی ہے۔ بالکل میری طرح، جیسے میرے جسم سے زندگی کی حدّت ختم ہو چکی ہے وہ سوچ کر حیران ہونے لگی۔ کس قدر جوش و جذبہ تھا مجھ میں۔ کبھی کسی مشکل سے گھبرانا تو سیکھا ہی نہ تھا میں ہر کرائسس سے لڑ جاتی تھی۔ اُس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ وہ زندگی کی دوڑ میں کبھی ہار بھی سکتی ہے لیکن منزل پا لینا کتنا بورنگ ہوتا ہے اُسے معلوم نہ تھا۔ زندگی سے جدوجہد ختم ہو جائے تو زندگی میں رہ بھی کیا جاتا ہے۔ اب ہوا چلنے لگی تھی اس نے دونوں ہاتھ گود میں سمیٹ لیے۔ درختوں سے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ گہرے سبز رنگ کے پتے ہوا میں لہراتے چکر لگاتے زمین پر پڑے ہوئے سرخی مائل پتوں کے ڈھیر میں آہستہ آہستہ شامل ہوتے جا رہے تھے۔ اُس نے جھک کر ایک پتے کو چھوا۔ ہر قسم کے پتوں کا ڈھیر تھا۔ چھوٹے بڑے، چوڑے لمبے۔ اس نے ایک خشک پتے کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی میں دبا کر اُٹھایا اور اسے اُلٹ اُلٹ کر دیکھنے لگی۔ شاید اب یہ پہچاننا بھی مشکل ہو کہ یہ کس درخت کا پتہ تھا لیکن اُن سوکھے ہوئے پتوں کو پہچاننے کی تکلیف کون کرے گا۔ اُسے ایک دم سے یہ محسوس ہوا کہ وہ بھی ایک ایسے پتے کی مانند ہے جو خشک ہو چکا ہے۔ کسی کو کیا پتہ میرا کس پیڑ کی شاخ سے تعلق تھا جس سے ٹوٹ کر میں ہزاروں میل دور آ پڑی ہوں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ شاید میں خود بھی بھولتی جا رہی ہوں۔ حالات کی ہوا کتنی تیز اور بے رحم ہوتی ہے سب کچھ اُلٹ پلٹ کر رکھ دیتی ہے۔ انسان بھول سا جاتا ہے کہ کس چمن سے اس کا تعلق تھا۔"(۱۵)

وطن سے دوری انسان کو جسمانی، ذہنی اور جغرافیائی لحاظ سے ناسٹیلجیائی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ "پاگل شہر" بھی ایک ایسا افسانہ ہے جس کا مرکزی کردار ہجرت کر کے لندن چلا جاتا ہے اور برسوں تک وہاں سکونت پذیر ہو جاتا ہے۔ شبانہ روز کی محنت اور بچوں کی دیکھ بھال کے ثمر میں وہ ایک کامیاب انسان بن جاتا ہے۔ اس کی اولاد لندن کی فضا میں رس بس گئی ہے اور وہ خود ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کرنے لگا مگر اُسے وطن کی یاد ہر وقت ستاتی رہتی ہے۔ اپنی مجبوریوں کے طفیل وہ اپنی دھرتی پر قدم نہیں رکھ سکا اور شاید زمانے کی ستم ظریفی نے یہ گُل کھلائے تھے کہ برسوں تک اُسے وطن سے دور رہنا پڑا۔ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزارنے پر اُسے وطن واپسی کی سوجھی۔ پینتیس (۳۵) سال کسی غیر ملک میں گزارنے کے بعد مادرِ وطن کی آغوش میں سکون کی تلاش میں واپس چلا آیا اور یہ بھول گیا کہ قلبی سکون تو ماں کی گود میں ملتا ہے۔ گود کی عمر تو گنوا دی۔ گور کا سکون اس کے اپنے اعمال پر انحصار کرتا ہے۔ وہ اپنے شہر کی ہر چیز سے محبت کا دم خم بھرتا ہے اور ہر خرابی کو گلے لگائے کسی بھی شکایت سے اجتناب کرتا ہے مگر اسے شکایت تھی تو شہر کے گھروں کے بڑے دروازوں سے۔ وہ جس معاشرے میں سکونت کے بعد آیا تھا وہاں کے گھروں کے دروازے شیشوں کے ہوتے تھے۔ کسی طرح کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا تھا۔ اُن کے دروازے ہر کس نہ کس کے لیے کھلے رہتے تھے مگر اپنے ملک میں اپنوں میں رہ جانے کے لیے بھی بڑی بڑی فصلیں اور مضبوط حصار کھینچ دیئے

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

گئے ہیں۔ اس کا اعتماد اس وقت کرچی کرچی ہو جاتا ہے جب اس کے ہم مذہب اس کے گھر میں ڈاکہ ڈالنے آدھمکتے ہیں اور کچھ نہ ملنے پر مرکزی کردار کو قتل کر دیتے ہیں اور اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ "میں اپنے وطن کے لیے جان دینا چاہتا تھا لیکن اس طرح تو نہیں" اپنے اندر انتہا درجے کا اضطراب لیے ہوئے ہے۔ اس افسانے کی تہہ میں ایک عمیق فلسفیانہ معنویت پوشیدہ ہے جس کا بنیادی خیال خود ساختہ جلاوطنی کا وہ سفر ہے جو جغرافیائی اور ذہنی جلاوطنی کی شکل میں اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ انسان اپنی تمناؤں اور خوشیوں کی خاطر نہ جانے کیا کیا کرتا ہے مگر محرومی انسان کو ذہنی جلاوطنی کا شکار بنا دیتی ہے اور اسے اپنے تمدن سے کٹنے کے بعد بھی محرومی کا احساس ستاتا رہتا ہے اور پھر پوری شخصیت کے گرد ایک گھیراؤ کی صورت میں ابدی جلاوطنی کے تاثر کو جنم دیتا ہے۔ یہ جلاوطنی بہتر مستقبل کی تلاش میں بہت حد تک خود ساختہ جلاوطنی ہے مگر وطن سے دوری اس کا المیہ ہے۔ اس کا اظہار افسانہ "پاگل شہر" میں دیکھنے کو ملتا ہے جس میں اس شہری کا انجام جو اپنی دھرتی ماں کی یاد میں غیر ملک میں سُلگتا رہتا ہے۔ وطن کی محبت کے رنگین نقوش کی مہر اس کے دل و دماغ پر ثبت ہو جاتی ہے۔ آخری وقت اپنے ملک کی زیارت کرنے اپنی ہی تہذیب کو گلے لگانے پر اُسے موت کی آغوش میں سُلا دیا جاتا ہے۔ صفیہ صدیقی نے اپنے کردار کے ذریعے سے ہمارے سماج کی اُن خرافات سے پردہ اُٹھایا ہے جن پر قلم اُٹھانا شاید مشکل تصور کیا جاتا ہے۔ غنڈہ گردی، ڈاکو راج، قزاقوں کی اجارہ داری اور لاقانونیت کے نقوش اتنے موزوں تراشے ہیں کہ اُن کے نقش سیدھے دل پر اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

شاہدہ احمد برصغیر کی خواتین افسانہ نویس ہیں جن کا نام ادبی مہجری حلقوں میں معتبر مقام پیدا کیے ہوئے ہے۔ ان کی زیادہ تر کہانیوں کا پلاٹ مغرب کی معاشرت، سماج اور نفسیات کا پس منظر پیش کرتا ہے۔ ان کے کرداروں میں دکھ کی نوعیت آفاقی ہے۔ انسانی قدروں کی شکست کا نوحہ ان کے ہاں نمایاں ہے۔ شاہدہ احمد کا افسانہ "بیرنگ چٹھی" اگلی نسل کے بہتر مستقبل کی خاطر یورپ کا سفر کرنے والی اس لڑکی کا مرقع ہے جو آج خود ماں کے روپ میں اپنی بیٹی کے مستقبل سے ہراساں اور خوف زدہ ہے۔ وہ بیٹی جو اپنے وطن میں اپنی ماں کو اپنا انتظار کرتا دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتی تھی آج خود انتظار کے دیئے جلائے دہلیز پر بیٹھ کر اپنی بیٹی کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ اماں کو مغرب کی وہ کہانیاں جو اُمید افزا ہیں۔ وطن کے نام بے ٹکٹ چٹھی کے وسیلے سے شاہدہ احمد نے مغرب کی ان سچائیوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے فرار ممکن نہیں۔ مٹھی بھر دھوپ، نمک لگی کیریاں، سنگترے کی شاخیں یادوں کا ایسا درپن جگاتی ہیں کہ خشک میوے سے بھری ٹوکریاں بھی شرما جائیں۔ ہجرتوں کا کرب شریانوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے مگر لبوں پر "شکر الحمد للہ"، "سب ٹھیک ہے" کی جھوٹی گردان سے اپنے دل کو بہلاوے میں رکھتا ہے جس میں مغربی سماج کی مجبوریاں اور اُن کی سودے بازی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ گھر بدلنے سے دلی تعلقات اور دماغی سوچ بدل جائے۔ نئے ملک میں نئے رشتے قائم کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حقیقی رشتوں ہی کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ اُن سے منہ پھیر لیا جائے۔ یہی چیز شاہدہ احمد اپنے افسانوں "بیرنگ چٹھی" اور "ہجرتوں کا بھنور" میں دکھانے کی جسارت کرتی ہیں۔ سفر کی انسان کو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ بعض سفر ایسے ہوتے ہیں جن میں منزل کا پتہ ہوتا ہے اور بعض سفر انجانی راہوں پر چلتے رہنے کا نام ہے۔ اس سفر میں انسان کو بہت سارے انسان میسر آتے ہیں جو اس کارواں میں آپ کا ساتھ دیتے ہیں اور بقول حیدر علی آتش کے:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہترے
ہزار ہا شجر سایہ دار رہ میں ہیں

(آتش)

جدید افسانہ نگاروں اور رومانوی ادیبوں کی طرح مہجری افسانہ نگاروں نے بھی فرد اور اس کے احساسات کو اُبھارنے کی جسارت کی ہے۔ جس میں رومانوی اظہارِ بیاں نے ایک نئی طرح قائم کی ہے۔ معاشرے کی نفسیات اور اقدار کا کُھل کر اظہار کیا گیا ہے۔ لیلیئن فرسٹ (Lilian Furst) نے ایک جگہ کہا تھا کہ:

"Through his special powers of perception and his more intense capacity for experience, has a profounder insight into the workings of the unirese then ordinary mortals."(16)

فن کار کے بارے میں یہی خیال نئی نسل کے مہجری افسانہ کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ ان افسانوں میں ادیب یا مرکزی کردار کی ذات اور اس کے اظہار پر زور دیا جاتا ہے۔ خارجی دنیا یا دوسرے کردار کا حقیقت پسندانہ عکس پیش کرنے کی بجائے ادیب دنیا کی موضوعی وضاحت پیش کرتا ہے۔ ان اظہاراتی افسانوں میں خارجی دنیا کی طرف توجہ مرکوز کرنے کے ساتھ ساتھ راوی یا مرکزی کردار کے داخلی تاثر کو اُبھارنے کی کوشش کی بھی جاتی ہے۔

خالد سہیل بھی ایسے رومانی افسانہ نگار ہیں جنہوں نے مرکزی کردار کے بیانیہ اسلوب کے طفیل اپنے تصورات اور معاشرتی جذبات واحساسات کا اظہار کیا ہے۔ اُن کے افسانوی مجموعے "دو کشتیوں میں سوار" اور "میرے قبیلے کے لوگ" شائع ہو چکے ہیں۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ماہرِ نفسیات ہیں۔ بڑی چوکس ذہانت اور فہم سے انسانی الجھنوں پر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں دو تہذیبوں کے رجحانات اور اقدار واضح رُخ اختیار کرتی سامنے آتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں محبت اور رومانیت دونوں چیزوں کا امتزاجی رنگ ملتا ہے۔ زندگی کی معصومیت، جوانی کے الھڑ پن اور تحریر کی رفتہ رفتہ تلخیوں سے ہم آہنگ ہوتی نظر آتی ہے۔ سماجی قوانین، طبقاتی سماج میں ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج رومانی فضا میں جکڑا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی اپنے حقیقی روپ میں رواں دواں دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنے طرزِ اظہار سے ماضی، حال اور مستقبل کی کڑیوں کو محبت اور احساس کی لڑی میں پروتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں محبت اور رومان کی جست چڑھی ہوئی ہے مگر بعد میں موضوعات کے اعتبار سے تبدیلی کے ساتھ ساتھ رومان کا انداز بدلتا گیا۔ بعد کے افسانوں میں رومان کی جلتی بجھتی روشنی جگنو کی طرح چمکتی نظر آتی ہے لیکن رومانیت کا بنیادی احساس تقریباً تمام افسانوں میں موجود ہے۔ انہوں نے جذبے اور احساس کی بہت سی منزلیں طے کی ہیں۔ رومان سے حقیقت کی طرف، تخیل اور تصور سے مشاہد کی طرف اور شاعرانہ جذباتی اندازِ بیان سے ایجاز وایمائیت کی طرف اور جذباتیت سے فکر کی وسعت اور گہرائی کی طرف جس خلوص سے قدم بڑھایا اس سے اُن کی فنکارانہ عظمت میں اضافہ ہوا ہے۔ اُن کے افسانے "دو کشتیوں میں سوار"، "شہوت بھری آنکھیں"، "شانتی۔۔۔ایک فاحشہ" اور "کنکر" اس کی مثال کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ نمونے کے طور پر افسانہ "کنکر" سے یہ اقتباس دیکھتے ہیں:

"نیلی نیلی آنکھیں، گھنگریالے کالے بال، سفید جلد، ستواں ناک، چہرے پر مسکراہٹ، دھیما دھیما لہجہ، ٹھہرا ٹھہرا گفتگو کا انداز، اس کی اپنائیت، اس کی بے تکلفی، اس کی بے ساختگی، اس کی خودسپردگی، ایک کنکر اندھے کنوئیں میں دور تک گرتا چلا گیا اور جب وہ پانی کی سطح سے ٹکرایا تو میں چونک اُٹھا۔ اس اندھے کنوئیں کے پانی میں کچھ لہریں اُبھریں۔ بیس برس پہلے کی لہریں جب زندگی میں پہلی دفعہ کسی کا سراپا میرے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا اس کا بھی ایسا ہی چہرہ تھا۔ ایسا ہی لہجہ، وہ میرے من کی جھیل کا پہلا کنکر تھا اور میں کتنا خوش تھا، کتنا نہال، اس بچے کی طرح جو گرمیوں کی بارش کی موسیقی پر بے خودی میں نہاتے ہوئے ناچتا ہے لیکن وہ بارش زیادہ دیر نہ رہی تھی اور میرا دامن اتنا بھیگ گیا تھا کہ اُسے نچوڑنا مشکل ہو گیا۔ کہاں کاغذ کا پیرہن اور کہاں بارش۔۔۔ میری پہلی محبوبہ نے میرے ساتھ رہنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا جیسے کوئی چور رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔۔۔"(۱۷)

جدید افسانہ نگاری میں رومانوی اسلوبِ بیان کی تین صورتیں ہیں اور بقول مسز لنڈ اونٹنگ کے پہلی صورت میں اسلوب کے اندازِ بیان میں حقیقت نگاری، بیانیہ انداز اور ادیب کے اپنی تخلیق سے معروضی فاصلہ کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اس طرح کے اسلوب کو Representational اور نقالی Representational سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوسرا اسلوب پہلے اسلوب سے غیر حقیقت نگارانہ ہونے کے سبب مختلف ہے۔ یہ اسلوب (Non-Minetic) اور مثالیاتی (Illustrative) ہے۔ تیسرے اسلوب کی شناخت غیر حقیقت نگاری، بیانیہ انداز اور اپنی تخلیق میں ادیب کی موضوعی موجودگی سے ہوتی ہے۔ ہم اس کو اظہاراتی اور تاثراتی اسلوب کا نام دے سکتے ہیں۔ خالد سہیل کے افسانے اس تیسرے رومانوی اظہاراتی اسلوب کے زمرے میں آتے ہیں۔ جس میں انہوں نے بیانیہ انداز اختیار کرتے ہوئے ماضی اور حال کے تصورات اور جذبات واحساسات کو رومانوی آہنگ سے مزین کیا ہے جس میں شعور کی رو کی تکنیک واضح طور پر اپنی جھلک دکھاتی ہے اور ان کا یہ اظہاراتی بیانیہ انداز مغربی رومانیت سے در آیا ہے۔

اُن کے افسانے "کنکر" اور "دو کشتیوں کے سوار" جیسے افسانوں میں خالد سہیل کی رومانیت کا حُسن محض منظر نگاری اور واقعہ نگاری تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ حُسنِ بیان میں بھی رومانی حُسن پیدا کر دیتے ہیں اور اگر صحیح کہا جائے تو ان کا شاعرانہ اظہار پوری قوت سے حسنِ بیان میں اُتر آیا ہے جس میں کردار کا سراپا، اس کی خوبصورتی اور اس کی جذباتی کیفیات کو بیان کرتے ہوئے حُسن پرستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کی قوتِ مشاہدہ، نفسیاتی شعور، ادراکی احساسِ جمال اور احساس کی گہرائی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ زندگی کے حُسن کو کتنی باریک بینی سے دیکھتے ہیں اور اسے کتنے پہلوؤں میں بیان کرتے ہیں۔ فطرت کا بیان، واقعات کا احوال، حُسن کی معصومیت اور سادگی کو وہ بڑے مزے لے لے کر تخلیقی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس سے ان کے کرداروں کا ظاہری اور باطنی حُسن کھل کر ہمارے سامنے آجاتا ہے اور قاری انہیں اپنی زندگی کے قریب تر محسوس کرتا ہے۔ ساحرانہ انداز میں خالد سہیل

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

کے افسانوں کی دلکشی، دلچسپی اور تاثریت دوگنا ہو جاتی ہے۔ واقعہ کسی بھی نوعیت کا ہو، کتنی ہی سچائی و صداقت سے مزین ہو، وہ اُسے اپنے حُسنِ بیان کی بدولت زندگی سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عزیز فاطمہ، ڈاکٹر، اُردو افسانہ سماجی و ثقافتی پس منظر، لکھنؤ، نصرت پبلیشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، (1984ء)، ص: (52-51)

۲۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر، اُردو افسانہ، 54ء تک، مشمولہ: پاکستانی ادب، مرتب: رشید امجد، انتخاب نثر، اسلام آباد، اکادمی ادبیات (پاکستان)، (1990ء)، ص: (123)

۳۔ رشید امجد، پاکستانی افسانے کا فکری اور سیاسی و سماجی پس منظر، اسلام آباد، اکادمی ادبیات (پاکستان)، (1990ء)، ص: (163)

۴۔ روبینہ الماس، اُردو افسانے میں جلاوطنی کا اظہار، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، (2012ء)، ص: (59)

۵۔ رضیہ کاظمی، ”عزت“، مشمولہ: اُردو افسانہ عہدِ حاضر میں، جلد اوّل، مرتب: رابعہ الرّباء، ملتان، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، (2017ء)، ص: (159)

۶۔ ایضاً، ص: (160)

۷۔ ایضاً، ص: (161)

۸۔ ایضاً، ص: (162)

۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نفسیاتی تنقید، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، (1982ء)، ص: (272)

۱۰۔ محمود ہاشمی، صفیہ صدیقی کے افسانے، مشمولہ: پہلی نسل کا گناہ، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، (1990ء)، ص: (8-7)

۱۱۔ صفیہ صدیقی، پہلی نسل کا گناہ، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، (1990ء)، ص: (68)

۱۲۔ ایضاً، ص: (48)

۱۳۔ ممتاز مفتی، ماہِ نو، کراچی، اگست (1955ء)، ص: (81)

۱۴۔ اظہر، غلام حسین، اوراق، افسانہ نمبر، جنوری (1970ء)

۱۵۔ صفیہ صدیقی، پہلی نسل کا گناہ، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، (1990ء)، ص: (15-14)

۱۶۔ Lilian R. Furst, Romanticism in presective, New York, Macmillan, (1969), Page: (67)

۱۷۔ خالد، سہیل، ڈاکٹر، دو کشتیوں میں سوار، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، (1994ء)، ص: (77)